مخلوط معاشرے کی زمین پر بوئی گئی زہریلی فصل

کالم نگار:۔ اوریا مقبول جان	تاریخ: 29 جولائی 2021

مخلوط معاشرے کی زمین پر بوئی گئی زہریلی فصل

اہلِ سیاست گنگ ہیں، اہلِ دانش حیران ہیں، منبر و محراب چُپ ہیں، سناٹا ہے، کوئی بولنے کی جرأت نہیں کر رہا۔ اس لیے کہ سب شریکِ جرم ہیں۔ سب نے کانٹوں کی اس زہریلی فصل کے بونے، اس کی نگہداشت کرنے اور اسے پروان چڑھانے میں مقدور بھر حصہ ڈالا ہے۔ اب اِس فصل کے زہریلے کانٹے حلق میں پھنس رہے ہیں، معاشرتی اور اخلاقی زوال کی بادِ سموم کے تھپیڑے ہمارے چہرے زخمی کر رہے ہیں تو سب عالمِ حیرت و خوف میں ہیں۔ ہماری شاہراؤں پر راہ چلتی عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں جنس زدہ ہیجانی درندوں کے ہاتھوں روز قتل ہو رہی ہیں، وہ جو مہذب کہلاتے ہیں، جہاں کبھی نرمگی و نفاست اوڑھنا بچھونا ہوتا تھا اور عورت کا یکساں ساتھ اور رقص و موسیقی کی خواب آور زندگی کا خواب گیں ماحول تھا، آج انکی نسلیں بھی عورتوں کو درندوں کی طرح قتل کر رہی ہیں، اذیتیں دے کر مار رہی ہیں، جنون میں پاگل ہوئی جا رہی ہیں۔

کیا ایسا آج سے صرف پچاس سال پہلے تھا؟ دل پر ہاتھ رکھ کر بولو، جس خدا کو مانتے ہو اُسے علیم و خبیر جان کر بتاؤ، جس تہذیب و تمدن سے محبت کرتے ہو اسی کے پیمانے میں تول کر بتاؤ، کہ کیا ہمارا معاشرہ اس قدر جنونی، دہشت زدہ، جنسی طور پر ہیجان انگیز اور خوفناک حد تک ظالم تھا؟ اگر آپ سچے ہیں تو میرے اس سوال کا جواب صرف اور صرف "نہیں" میں آئے گا۔ ہم نے کونسی فصل بوئی ہے جس کے کانٹے اب آکر نکلے ہیں۔ یہ تو وہی فصل ہے کہ جو ہم سے تقریباً ایک سو سال پہلے مغربی دُنیا

نے بھی بوئی تھی اور آج اس معاشرے میں جرم و گناہ اور تشدد و بربریت کی جو اقسام پائی جاتی ہیں، ہمارے معاشرے میں بھی ان کا ظہور ہو چکا ہے۔ یہ فصل کونسی ہے؟ کوئی تو بتائے، کھل کر نام لے۔ لیکن اس سے پہلے کہ فصل کی بات ہو، جس سرزمین پر یہ بوئی جاتی ہے، جس مٹی میں پروان چڑھتی ہے اس کا نام ہے..."مخلوط معاشرہ"۔

منبر و محراب چُپ ہیں، کوئی نہیں بولتا کہ اللہ اور اُس کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے جس معاشرے کو ایک آئیڈیل معاشرہ قرار دیا، وہ ہرگز ہرگز مخلوط نہیں تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں گذشتہ پچاس سالوں میں ہم نے جس قدر محنت، اپنے معاشرے کو مخلوط بنانے میں صرف کی ہے کسی اور طرف اس کا ایک فیصد بھی نہیں لگایا۔ آج اس ملک کا ہر ادارہ، چوک چوراہا، گھر دربار، ہوٹل بازار، ہسپتال، سکول یہاں تک کہ وہ ادارے جو کبھی کبھار حالتِ جنگ میں کام آتے ہیں، وہ سب بھی مخلوط ہو چکے ہیں۔ ہماری بے حسی اور مغرب پرستی کا عالم یہ ہے کہ ہم نے اپنی عسکری صفوں کو اس وقت مخلوط کیا، جب پوری دُنیا میں امریکی اور نیٹو افواج کے اپنی ہم پیشہ خواتین کے ساتھ جنسی تشدد سے لے کر جنسی اختلاط کے لاتعداد واقعات سامنے آرہے تھے اور دُنیا بھر کا میڈیا انہیں دوستانہ حملہ (Friendly Fire) کہہ کر ہنسی میں اُڑا رہا تھا۔ ہمارے معاشرے پر ایسا ظلم تو گورے نے بھی نہیں کیا تھا جو اس برصغیر پر ڈیڑھ سو سال تک حکمران رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ اس دَور میں خود برطانیہ کا معاشرہ بھی قدیم روایت و اخلاقیات کا پابند تھا۔ وہاں عورتوں کو تعلیم تو دی جاتی تھی، لیکن ان کے لیے سکول اور ادارے مختلف ہوتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ کی یونیورسٹیوں میں عورتوں کو سکولوں میں داخلے کی اجازت تو ملی، لیکن کلاسیں پھر بھی علیحدہ علیحدہ ہوا کرتی تھیں۔ یورپ کی دیکھا دیکھی برطانیہ میں آکسفورڈ، کیمبرج اور لندن سکول آف اکنامکس نے بھی 1920ء کے آس پاس یونیورسٹی کی سطح پر خواتین کیلئے اپنے دروازے کھولے، لیکن ان عورتوں کو مخصوص کالجوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ اس کی مثال آکسفورڈ کا لیڈی مارگریٹ ہال ہے، جسے 1979ء یعنی صرف تقریباً چالیس سال قبل مخلوط کیا گیا۔ اسی طرح آکسفورڈ ہی کے عورتوں کیلئے ایک اور مخصوص کالج سینٹ ہوگ (St. Huge) کو 1986ء میں مخلوط کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گورے نے برصغیر پاک و ہند میں بھی یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم کو مخلوط کیا، لیکن نیچے تمام تعلیمی ادارے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے علیحدہ ہی رہے۔ ہم نے ایک عالمی بھیڑ چال پر عمل کیا، جس کے نتیجے میں آج ہم نے یہ "کامیابی" حاصل کر لی ہے کہ وہ ملک پاکستان جس میں آج سے چالیس سال قبل کوئی مخلوط تعلیمی ادارہ ڈھونڈنا مشکل تھا، وہاں اب صرف خواتین کی تعلیم کیلئے علیحدہ معیاری ادارے ڈھونڈنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو چکا ہے۔ صرف وہی چند ایک پرانے سرکاری ادارے ہیں جو سالوں سے چلتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی منصوبہ بندی میں اس کے تمام عوامل کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرے کا سب سے اہم ترین خاصہ اس کی پدرسری خاندانی زندگی ہے۔ "عورت مارچ" میں اس پدرسری کو گالی دی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے ننانوے فیصد گھرانوں میں آج بھی کمائی کا بنیادی ذمہ دار (Sole Bread Winner) مرد ہی ہے۔ اس عالم میں ایک مرد کی تعلیم اور ہنر کیلئے زیادہ

سے زیادہ مواقع پیدا کئے جانے چاہئے تھے، تاکہ زیادہ سے زیادہ خاندانوں کا سربراہ معاشی طور پر مضبوط ہو اور زیادہ سے زیادہ خاندان بہتر زندگی گزار سکیں۔ لیکن برابری، حقوقِ نسواں کے نعروں اور میرٹ کی بالادستی کو ملا کر ایک ایسی مکس چارٹ تیار ہوئی، جس کے تحت ان مخلوط تعلیمی اداروں میں یکساں میرٹ لسٹیں تیار ہونا شروع ہوئیں اور آج وہ مرد جس نے اس معاشرے کے خاندانی نظام کی معاشی باگ ڈور سنبھالنا تھی، اس کیلئے معیشت کے دروازے بند ہونے لگے، ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے اتنی رہ گئی، اب میڈیکل اور انجینئرنگ جیسے شعبوں میں بھی لڑکے صرف 25 فیصد کے قریب ہیں۔ اختلاط، معاشی خود مختاری اور خواتین کی بندھنوں سے گلو خلاصی (Emancipation) نے مل کر ایک ایسا پاکستانی معاشرہ تخلیق کر دیا، جس کا آئیڈیل لائف سٹائل صرف اور صرف ایک ہی ہے یعنی "مغرب کا سیکولر لبرل" لائف سٹائل جو دو اصولوں کے گرد گھومتا ہے... ذہنی خوشی اور ذاتی کامیابی۔ آپ وقتی خوشی کیلئے اخلاق، اقدار، اولاد، بیوی، والدین سب کچھ قربان کر سکتے ہیں اور ذاتی کامیابی کی راہ میں اگر بھائی یا باپ بھی آجائے تو اسے روندتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔

جو خاردار درخت اور کانٹے دار جھاڑیاں ہمارے ہاں آج سر اُٹھا رہی ہیں، امریکہ اور یورپ ان میں گذشتہ پچاس سال سے بری طرح اُلجھے ہوئے ہیں۔ ان معاشروں میں آج قتل ہونے والی خواتین میں سے چالیس فیصد وہ ہیں جنہیں اُن کے پہلے والے خاوند یا بوائے فرینڈ اذیتیں دے کر قتل کرتے ہیں۔ ان خاوندوں کے علاوہ وہ مرد اور عورتیں جنہوں نے درجنوں قتل کئے ہیں، جنہیں "سیریل کلر" کہا جاتا ہے، ان کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ان کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد بھی لاکھوں میں

ہے۔ ایسے جنونی کہ کوئی مقتولہ کے خون کے فوارے سے نہاتا ہے تو کوئی اُسے ریفریجریٹر میں رکھ کر کھاتا ہے۔ اخلاقیات کی آزادی نے مخلوط معاشرے کیساتھ مل کر وہاں ایک ایسی خوفناک صورتحال پیدا کر دی ہے کہ ایک عورت دفتروں، بازاروں، سکولوں، کارخانوں، فوجی یونٹوں، یہاں تک کہ لفٹ اور باتھ روم میں بھی محفوظ نہیں۔ اس مغربی معاشرے کے مقابلے میں گذشتہ صدی میں ستاون اسلامی ممالک کا مسلم معاشرہ بھی ساتھ ہی پروان چڑھ رہا تھا۔ اس معاشرے نے اتنے عرصے میں خود کو مخلوط ہونے سے بچائے رکھا اور آج ان ستاون اسلامی ممالک کی صورتحال کا موازنہ مغرب کے کسی بھی ملک سے کرکے دیکھ لیں۔ صرف "سیریل کِلر" کی ہی لسٹ اٹھالیں، ہزاروں لوگوں کی اس فہرست میں مسلمان ممالک میں ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں بنتی۔

کون اس بات کا ماتم کر رہا ہے کہ جدید سیکولر لبرل اخلاقیات کی کوکھ سے جنم لینے والے معاشرے کی زد میں آکر صرف مسلمانوں کا تہذیب و تمدن ہی تباہ ہوا ہے۔ یہ ماتم تو پوری انسانیت کا ہے جو اب ایک تماش بینوں کا ہجوم بن چکی ہے اور اس نے اس دُنیا کو ایک بہت بڑے سٹیڈیم میں تبدیل کر دیا ہے جس کے بیچوں بیچ عورت پُتلی تماشے کی طرح تماش بینوں کی ضرورت کے مطابق کرتب دِکھا رہی ہے۔ نسبتاً کم غلیظ اذہان کیلئے وہ صرف فیشن انڈسٹری کی ماڈل ہے جو اپنے اعضائے جسمانی کی مناسب نمائش سے ہر وہ مال بیچنے کیلئے اپنی صلاحیتیں صرف کرتی ہے جو اُسے دیا جاتا ہے۔ تماش بینوں کے ذوقِ نظر اور اشتہا کے مطابق فیشن شو کی منڈھیر (Ramp) پر وہ با اندازِ دلربائی کیٹ واک کرتی ہے۔ دُنیا بھر کی فیشن انڈسٹری کی مصنوعات اس خاتون

کو مرکزِ نگاہ اور شمع محفل بنانے میں مصروف ہیں۔ پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک اس "بیچاری" کا ہر عضو بازار کی زینت ہے، جہاں اس کی حیثیت اور مرتبہ و مقام اس کی جسمانی پیمائش اور ظاہری صورت کی جاذبیت کی بنیاد پر متعین کیا جاتا ہے۔ اسی فیشن انڈسٹری کے فانوس کے گرد لاتعداد صنعتیں طواف کر رہی ہیں جن میں سب سے مکروہ، انٹرٹینمنٹ کی صنعت ہے، جو دُنیا بھر کی سیاحت کا رات کا چہرہ (Night Life) ہے۔ یہ نچلی سطح پر جسم فروشی سے شروع ہو کر مساج پارلروں، سیکس کلبوں سے ہوتی ہوئی جہانِ فلم وڈرامہ میں داخل ہوتی ہے۔ فلم اور ڈرامہ کی دُنیا میں کہیں جنسی ہیجان پیدا کرنے کیلئے صرف ایک معمولی سا سیکس سین ہی فلم میں داخل کر لیا جاتا ہے اور کبھی کبھار پوری فلم ہی فحاشی کا مرکز تخلیق ہوتی ہے۔ پوری دُنیا جو اِس وقت ایک تماش بین گروہ ہے، اس کے سامنے اس سارے تماشے کا مرکزی کردار عورت اور صرف عورت ہے۔ مرد وہاں صرف ایک مہمان اداکار کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ کروڑوں لڑکیاں فحش فلموں میں کام کر چکی ہوں گی، لیکن مردوں کی تعداد لاکھوں میں بھی نہیں۔ اِسی طرح جسم فروشی، ڈانسنگ کلب، مساج پارلر اور دیگر تمام فحاشی کے اڈے عورت کے ہی دَم قدم سے آباد ہوتے ہیں۔ مردوں کا وجود اکثر اوقات دوسرے درجے کے سہولت کار والا ہوتا ہے یا جیسے سکیورٹی گارڈز، مارکیٹنگ والے اور منیجر وغیرہ۔ کیا یہ سب کچھ جو دُنیا میں ہو رہا ہے، صرف مسلم معاشرے کا ماتم ہے؟ نہیں... ہرگز نہیں... یہ پوری انسانیت کے زوال کا ماتم ہے۔ دُنیا جس میں اس وقت اقوامِ متحدہ کے نزدیک سالانہ چالیس لاکھ جسم فروش عورتیں اپنے ملکوں سے خرید کر یا اغواء کر کے بڑے بڑے شہروں میں

بٹھائی جاتی ہیں۔ اس مہذب دُنیا کے اُجڑنے کے المیے کو یار لوگوں نے صرف مسلمانوں کے اکیلے ماتم کرنے کی وجہ قرار دے کر اس پر مشہور فرانسیسی فلسفی راجر گراوڈی (Roger Garaudy) کا یہ فقرہ چسپاں کر دیا کہ "اسلام ازم دراصل اسلام کی ایک بیماری ہے"۔ مسلمانوں کے ماتم کی صرف ایک وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے مسلم معاشرے کے خوبصورت چہرے کے آخری زمانے کو دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری نسل کے دُنیا سے چلے جانے کے بعد ماتم کرنے والا بھی کوئی نہ رہے۔ اس المیے سے دُنیا کے ہر ملک میں وہ نسل ضرور گزری ہے جس نے تہذیب اُجڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ جب یورپ میں شروع شروع میں اس تہذیبی تبدیلی کا آغاز ہوا تو وہاں بھی ہماری طرح ماتم کرنے والے بہت تھے۔ کبھی سولہویں اور سترہویں صدی کے انگلینڈ میں چلنے والی بنیاد پرستی (Puritanism) کی تحریک کا جائزہ لیں کہ کیسے پہلے انگلینڈ اور پھر یورپ اپنی عفت مآب باحیاء تہذیب کے تحفظ کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اپنے معاشرے کو بچانے کیلئے یہ انکی آخری چیخ تھی جو ایک تحریک کی صورت یورپی معاشرے میں "انتہائی احتیاط (Puritanism) "کے نام پر بلند ہوئی۔ یہ "آواز" پکارتی رہی کہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزارنا چاہیئے۔ ان کے ہاں عورت کا ایک ایسا تصور تھا جو خاندان میں تربیت و تعلیم اور محبت و سرشاری کا مرکز تھی جسے وہ "Godly Women" اللہ کے بتائے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے والی عورت کہتے تھے۔ ان لوگوں کی تحریک نے ایک دفعہ تو سیکولرازم اور لبرل ازم کے کارواں کے راستے روک لیے تھے مگر چرچ کے اختلافات اور مذہبی

طبقوں کی تعیش پسندی نے سیکولر اخلاقیات کا راستہ ہموار کر دیا اور آج پورے یورپ میں مذہب اجتماعی نہیں بلکہ ذاتی زندگی سے بھی نکل چکا ہے۔ اگر راجر گراوڈی کے مطابق اسلام ازم ہی اسلام میں ایک بیماری ہے تو پھر سیکولرازم پوری انسانی تہذیب کی بیماری ہے، جس نے صدیوں پرانی انسانی اخلاقیات اور شرم وحیا سے آراستہ بستیوں کو اُجاڑ کر رکھ دیا اور آج اس بیماری کے تعفن میں لتھڑی، عورت کی مظلوم لاش دُنیا کے میدان کے بیچوں بیچ پڑی ہے۔ تشدد سے زخمی، جنسی مطالبات کی تھکن سے چُور، شمع محفل بننے کی آراستگی کے مصنوعی پن سے دلبرداشتہ، بیک وقت گھر اور معاشی میدان میں بھاگنے کی وجہ سے نُچڑی ہوئی۔ المیہ یہ ہے کہ گذشتہ دو سو سال کی اس جنگ میں عورت کے ہاتھ میں نہ عزت آئی، نہ مقام و مرتبہ۔ ماں کے مقامِ حرمت سے گری، بیوی کی دلنواز کرسی سے لڑھکی، بہن کی غیرت کے پائیدان سے پھسلی اور ہاتھ کیا آیا؟ مردوں کی طرح دفتروں میں مزدوری و محنت اور گدھوں والی زندگی۔ ہر ملک کی سیاست میں ابھی تک دستِ نگر ہے اور دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی میں اس کا حصہ شاید ایک فیصد سے بھی کم اہمیت کا حامل ہے۔ کس قدر دُکھ کی بات ہے کہ اس عورت کو مرد سے مقابلے کے خواب دکھا کر پہلے اس سے اپنا گھر تباہ کروایا گیا اور اسی تباہی کیلئے اسے خواب ایسے دیئے گئے جو اگلی کئی صدیوں تک بھی پورے نہ ہو سکیں۔ زہریلی فصل جو بوئی گئی تھی اس کے کانٹے اب دُنیا بھر میں پھیل چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ برق رفتار ہو چکا ہے۔ 1918ء میں دُنیا میں اِسی کرونا خاندان کا ''سپینش فلو'' پھیلا تھا مگر آہستہ آہستہ، یعنی دو سالوں میں جا کر کہیں دُنیا بھر میں پھیلا۔ لیکن آج کی تیز رفتاری دیکھیں کہ دسمبر 2019ء میں چین کے شہر ''ووہان'' سے شروع ہونے

والا "کرونا" مارچ 2020ء میں سات سمندر پار امریکہ تک جا پہنچا تھا اور چند ماہ بعد اس نے پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انسانی تہذیب کی عفت و عصمت اور باحیا زندگی کا زوال دُنیا بھر میں پھیلے سیٹلائٹ سے منسلک میڈیا کے زورِ بازو سے ہے۔ آپ کا اخلاقی، معاشرتی نظام صرف چند منٹ کا اشتہار، ایک آدھ گھنٹے کا ڈرامہ اور کچھ ثانیوں کا فحش فلم کا کلپ برباد کر سکتا ہے۔ اس تہذیبی زوال تلے کچلی ہوئی عورت کی روداد اقوامِ متحدہ کے تحقیقی ادارے "UN Women" کی رپورٹوں کے ان شواہد کے حوالے سے دیکھئے۔ اعداد و شمار کے مطابق دُنیا میں 73 کروڑ 60 لاکھ عورتیں تشدد کا شکار ہوتی ہیں جن میں سے 64 کروڑ عورتیں اپنے موجودہ یا سابقہ خاوندوں اور بوائے فرینڈز کے ہاتھوں تشدد سہتی ہیں۔ صرف 2017ء میں 87 ہزار عورتیں قتل ہوئیں جن میں سے 50 ہزار کو ان کے شوہروں، سابقہ شوہروں یا بوائے فرینڈوں یا سابقہ بوائے فرینڈوں نے قتل کیا۔ سب سے بدقسمت وہ کمسن بچیاں ہیں جو 19 سال سے کم ہیں اور میڈیا کی ترغیبات کے تحت کسی کے ساتھ رہنا شروع کرتی ہیں یا اس کی محبت میں گرفتار ہوتی ہیں۔ ایسی بچیوں میں سے ہر تیسری بچی بدترین تشدد کا شکار ہوتی ہے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا صرف ایک صدی قبل دُنیا کے کسی بھی معاشرے خواہ یورپ ہو یا افریقہ، ایشیاء ہو یا آسٹریلیا، ایک گھر اتنا ظالم، متشدد، ہیجان انگیز اور خوفناک تھا۔ ہرگز نہیں تھا۔